افکار اقبال پر رومی کے اثرات

سید انور حسن زاہدی

مولانا جلال الدین رومی (۶۷۲-۶۰۴) نے ۶۸ سال سے زیادہ اس دنیا میں زندگی بسر کی اور ابتدائی چالیس برسوں تک شعری تخلیق سے نہیں کی بلکہ غیر معمولی ذوق وشوق کے ساتھ علمی و دینی امور و مسائل میں سرگرم رہے اور ان کے وعظ و تدریس کا سلسلہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ جاری رہا ایک روز شمس تبریز نے جنہیں ان کے علم نوری کے سبب ''شمس پرندہ'' بھی کہا جاتا تھا، ۶۴۳ھ میں مولانا کو درسیات اور مباحث کے عمق ومحویت سے چونکاتے ہوئے ان کی توجہ کشف وشہود کی طرف مبذول کرائی اور مدرسوی قیل و قال کی حقیقت ان پر واضح کردی اور ان کے دریائے شوق میں ایسا تلاطم برپا ہوا کہ مولانا مسند تدریس وفتاویٰ کو الوداع کہتے ہوئے محفل رقص وسماع میں داخل ہوگئے اور شعر کہنا شروع کردیا[۱] جب کہ ان کے خاندان میں سب عالم دین تھے۔ اس معلم عشق (شمس تبریز) کے سبق نے مولانا کو اس منزل پر پہنچادیا کہ اب ان کے دل کی زبان اس راز کارساز کے علاوہ کچھ نہ کہتی تھی اور اس راہ میں مولانا اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہیں ساتویں صدی ہجری کا سب سے بڑا شاعر کہا جاسکتا ہے۔[۲] مولانا کی یادگار تصانیف نثر ونظم دونوں پر مشتمل ہیں۔ ان خطوط کے علاوہ جو انہوں نے خود لکھے ان کی بیشتر نثر تقریر یا املا ہے۔ املا اور تقریر کے حوالے سے جو کچھ محفوظ ہے اس میں سب سے پہلے ''فیہ مافیہ'' اور اس کے بعد مجالس سبعہ کا ذکر آتا ہے۔ فیہ مافیہ میں مولانا کے وہ افکار ہیں جو انہوں نے اپنی بزم آرائیوں میں بیان فرمایا تھا جو کہ عرفانی اور اخلاقی مواد سے پر ہے لیکن ''مجالس سبعہ'' مولانا کے ان خیالات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے شمس تبریز سے ملاقات سے قبل منبر پر بیان فرمایا ہے، مولانا کے یہ بیانات ان کی روحانی شخصیت پر تحقیق وجستجو کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں اس کے علاوہ جو کچھ شعر کے حوالے سے محفوظ رہا وہ مثنویات، غزلیات، اور رباعیات پر مشتمل ہے جس میں خاص بات یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ مولانا کی سرمستی و

وجد و بے خودی جیسی کیفیات کا نتیجہ ہے اور یہ ایسے اشعار ہیں جو خالق جان و جہان کے حوالہ سے کہے گئے ہیں، جن سے مولانا کے طبعی میلان و رجحانات کا اندازہ ہوتا ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب کی طرح مولانا جلال الدین رومی کی شخصیت تعارف کی چنداں محتاج نہیں جب کہ ایسی بہت سی شخصیات گذری ہیں جن کے بیش بہا افکار زمانہ کی رفتار کے ساتھ تلف ہوگئے اور ہم تک نہ پہنچ سکے۔ آج ہمارا فریضہ ہے کہ وہ گرانقدر ادبی و ثقافتی سرمایہ جو ہمیں ہمارے آباء و اجداد سے ملا ہے اسے زمانے کے سامنے لائیں تا کہ دنیا والے نہ فقط اس سے آگاہ ہوں بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ اس سے فائدہ بھی اٹھا سکیں۔ ۳

آج جب کہ انسانی زندگی کی قدر و قیمت میں بڑی حد تک تبدیلی آچکی ہے اور نئے افکار و پرانے خیالات کے مابین خلیج سی پیدا ہوگئی ہے۔ دنیا بھر کے مفکروں اور دانشوروں کے لئے مولوی کا چہرہ منتخب اور آشنا ترین چہرہ ہے، مولانا کے دائمی ترانے عہد حاضر کے تقاضوں سے کاملاً ہم آہنگ ہیں، جب کہ متقدمین بھی مولانا کی عرفانی عبارت سے بہرہ مند ہوتے رہے ہیں اور بعضوں نے تو مثنوی مولانا کو ''پہلوی زبان میں قرآن'' تک کہہ دیا مگر فی زمانہ جتنا اقبال نے رومی کے افکار سے اثر قبول کیا ہے اور جس طرح انہیں اپنی تخلیقات میں خصوصی مقام دیا ہے اس کی مثال شاید ہی ممکن ہو۔ اقبال انہیں ہمیشہ پیر و مرشد کے نام سے یاد کرتے ہیں، جیسا کہ فرماتے ہیں:

رومی خود بنمود پیر حق سرشت　　کو بہ حرف پہلوی قرآن نوشت
موجم و در بحر او منزل کنم　　تا در تابندہ ای حاصل کنم
من کہ مستی ھا ز صہبایش کنم　　زندگانی از نفس ہا لیش کنم

اقبال روحانی طور پر مولانا سے اتنے متاثر ہیں کہ فرماتے ہیں ؎

فکر من بر آستانش در سجود

اقبال اپنی عمر کے آخری حصہ میں ضعف بینائی کے سبب مطالعہ نہیں کر سکتے تھے، پھر بھی وہ مولانا کی مثنوی کا مطالعہ ضرور کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ایک سفر نامہ میں لکھتے ہیں:

''عرصہ ہوا میں نے مطالعہ کرنا چھوڑ دیا پھر بھی اگر کچھ پڑھتا ہوں تو قرآن مجید یا مثنوی مولانا''۔

اقبال معنوی طور پر خود کو مولانا سے اتنا قریب پاتے ہیں کہ اگر کوئی فلسفی ان کے پائے ایمان و استقلال میں تزلزل پیدا کر دیتا ہے اور ان کے فکری سفینہ کو کسی بھنور میں ڈھکیل دیتا ہے تو مولانا

حضرت خضر کی طرح اقبال کے ہاتھوں کو تھام لیتے ہیں اور انہیں ساحل عشق اور منزل مقصود تک پہنچادیتے ہیں۔ اقبال اپنے فکری حالات کو ''رومی و ہیگل'' نامی نظم میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

می گشودم شبی بہ ناخن فکر — عقدہ ہای حکیم ایمانی
آن کہ اندیشہ اش برہنہ نمود — ابدی راز کسوت آنی
پیش عرض خیال او گیتی — خجل آمد ز تنگ دامانی
چون بہ دریائے او فرو رفتم — کشتی عقل گشت طوفانی
خواب بر من دمید افسونی — چشم بستم ز باقی و فانی
نگہ شوق تیز تر گردید — چہرہ بنمود، پیر یزدانی
آفتابی کہ از تجلی او — افق روم و شام نورانی
شعلہ اش در جہان تیرہ نہاد — بہ بیابان چراغ رہبانی
یعنی از حرف او ہمی روید — صفت لالہ ہای نعمانی
گفت با من چہ خفتہ ای برخیز — بہ سرابی سفینہ می رانی
بہ خرد راہ عشق می پویی — بہ چراغ آفتاب می جویی

یعنی اقبال فرماتے ہیں کہ ایک رات میں فکر کے ناخن سے جرمنی کے مشہور مفکر ہیگل کے حکیمانہ عقائد کی گتھی سلجھانے میں محو تھا اور مجھے اپنی عقل کا دامن تنگ نظر آرہا تھا لیکن جیسے ہی میں نے مولانا روم کے افکار کے بحر ناپیدا کنار میں غوطہ لگایا تو میرے عقل کی کشتی میں طوفانی کیفیت پیدا ہوگئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کیا خواب غفلت میں پڑا ہوا ہے اور دریا کے بجائے سراب میں کشتی چلا رہا ہے؟ تو عقل کے ذریعہ عشق کی منزل طے کرنا چاہتا ہے اور چراغ کے ذریعہ آفتاب کی تلاش کرنا چاہتا ہے۔

اقبال کی جملہ تصانیف میں جہاں مولوی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، وہیں یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اقبال، مولانا کے تئیں غیر معمولی احترام کے قائل ہیں۔ مثنوی جاوید نامہ جو کہ اقبال کے اوج فکری اور شاہکار ہونے کا ثبوت بھی ہے، مولانا کی شخصیت ہر جگہ اور ہر بیت میں اقبال کی رہبری اور رہنمائی کرتی نظر آتی ہے۔ اقبال کا یہ خلوص و ارادت محض زبان تک مخصوص و محدود نہیں ہے بلکہ اس کے گہرے اثرات اور چھاپ ان کے تمام علمی اور فکری کارناموں میں بھی نظر آتی ہے۔ سر دست ان میں سے بعض کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

واضح رہے کہ اقبال کی تصانیف میں اشعار کا بڑا حصہ مولوی کی طرز پر نظم کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بیشتر فارسی اشعار مولانا کی عظمتوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے اسلامی و عرفانی افکار کی نشر و اشاعت کے لئے نظم کئے ہیں اس لئے مثنوی ''گلشن راز جدید'' کے علاوہ جو محمود شبستری کے سلسلے میں کہی گئی تمام مثنویاں یعنی اسرار خودی، رموز بیخودی، بندگی نامہ، جاوید نامہ، مثنوی مسافر، اور ''پس چہ باید کرد ای اقوام شرق'' بحر رمل مسدس محذوف میں ہی نظم کی گئی ہیں جو کہ مولوی کی پسندیدہ بحر رہی ہے۔

علامہ اقبال نے ان تمام مثنویوں میں دینی، عرفانی اور سماجی مسائل کو بیان کرتے وقت مولانا کے افکار و نظریات کی گہرائی اور گیرائی کو اہم مرتبہ و مقام دیا ہے اور اکثر مقامات پر مولانا کے اشعار سے استشہاد کیا ہے۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی میں سبک سے لیکر رمزیت تک اقبال، مولانا کے آہنگ سے بہت نزدیک نظر آتے ہیں کہ بہت سے موضوعات کی توضیح کے لئے حکایتوں اور تماثیل سے استفادہ کیا ہے، اور ایسے موقعوں پر مولانا کے اشعار پر تضمین کی ہے:

شرح راز از داستانہا می کنم　　غنچہ از زور نفس وا می کنم
خوشتر آن باشد کہ سر دلبران　　گفتہ آید در حدیث دیگران

اس کے علاوہ ''بال جبرئیل'' میں علامہ اقبال کی ایک دلچسپ نظم ''پیر و مرشد'' ہے جس میں پیر سے مراد رومی اور مرید سے مراد علامہ اقبال ہیں۔ اس نظم میں اقبال نے مولانا کی مثنوی کے تمام دفاتر سے استفادہ کرتے ہوئے سوالات و مکالمہ کے طور پر اس کے دقیق معانی اور مفاہیم بیان کئے ہیں۔ معانی زیبا، حقیقت انسانی، اصل جہاد اسلامی، وطن جہانی مسلمانان، عشق و خرد، جبر و قدر، بیداری دل، خودی و بیخودی، اکل حلال اور آداب خلوت و جلوت وغیرہ نمایاں طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پیر رومی کے مرید اقبال نے ابدی حقائق اس طرح بیان کئے ہیں کہ ان کی گفتگو کبھی پرانی نہیں ہوسکتی۔

اقبال کہتے ہیں:

جاری است از چشم بنہا جوی خون　　کز علوم تازہ دین زارو زبون

رومی کہتے ہیں:

علم را برتن زنی باری بود　　علم را بر دل زنی یاری بود

اقبال

ای امام عاشقان دردمند — یاد دارم از تو این حرف بلند
خشک مغز و خشک تار و خشک پوست — از کجا می آید این آواز دوست
دور حاضر هست چنگ و بی سرور — بی نهایت، بی یقین و بی حضور
کئی خبر او را که این آواز چه؟ — دوست که، آن دوست را خود راز چه؟
گر اروپا با فراغ و تابناک — نغمه او را می کشاند سوی خاک

رومی

بر سماع راست هر کس چیر نیست — طعمهٔ هر مرغکی انجیر نیست

اقبال

خوانده ام اندر علوم شرق و غرب — روح را باقی هنوز بس درد و کرب

رومی

دست هر نااهل بیمارت کند — سوی مادر آ که تیمارت کند

اقبال

ای نگاه تو دهد دل را گشاد — باز گو آن نکته حکم جهاد

رومی

نقش حق را هم به نقش حق شکن — بر زجاج دوست سنگ دوست زن

اقبال

شد نگاه خاوران مسحور غرب — بهتر از حور بهشتی حور غرب

اقبال کی نظر میں مولوی کے افکار ان کے دور کے افکار میں ہیں کیونکہ اسلامی اقوام کی زوال پذیری مولوی اور اقبال کے دور میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ساتویں ہجری یا مولوی کا زمانہ، مغلوں کے وحشیانہ حملوں کا دور تھا جس میں چار جانب قتل و غارتگری، خونریزی، سفاکیت اور در بدری عام تھی، اسلامی ممالک کے رو بزوال ہونے کے دو بنیادی اسباب تھے جو اس زمانے کی ملی زبوں حالیوں کا باعث تھے، ایک تو اس زمانے کی غیر اسلامی تعلیمات تصوف جس کی شروعات مسلمانوں میں تیسری صدی ہجری سے ہی دکھائی دیتی ہے، اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتے

ہوئے ایران سے روم تک پھیل گیا، مسلمان مختلف تہذیبوں اور نت نئی فکروں سے آشنا ہوئے، گوناگوں قسم کی کتابیں، فلسفے اور حکمتیں عربی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں اور اس سے استفادہ کیا جانے لگا اور شدہ شدہ یہ فکریں ان کی زندگی کا جز بن گئیں۔ دنیا و مافیہا سے کنارہ کشی، گوشہ نشینی، آدم بیزاری کے ساتھ ساتھ عدم و لاموجودیت کا رجحان مسلمانوں میں پروان چڑھتا گیا، چھٹی ساتویں صدی ہجری تک فنا، جبر، قناعت، تسلیم، عجز، فروتنی اور عدم نسل افزائی جیسے منفی صوفیانہ عقائد نے جنگجو اور تحریکی مسلمانوں کو انتہائی کمزور کردیا، مذہبی نظریاتی اختلافات اور لاہوتی بے معنی بحثوں نے انہیں موہومی اور مضمحل انسان بنادیا، نتیجہ میں مٹھی بھر وحشی مغل اٹھ کھڑے ہوئے اور لاکھوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتاردیا اور ایک مختصر سے عرصہ میں اسلام کے ہمالیائی تہذیبی سرمایہ کو خاک میں ملادیا ۔ اس خونریزی وقتل عام کے بعد جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگئے اور غاروں، پہاڑوں کی آغوش اور کھنڈروں میں زندگی بسر کرنے لگے۔ دوسری طرف سماج میں صاحب قدرت اور جنگ آزما لوگ تلاش کرنے پر بھی میسر نہ تھے، مولانا جو ہمیشہ مسلمانوں کے وقار و سربلندی، طاقت قوت کے خواہاں اور جویا تھے اس زمانے کے سماج میں بہادر اور سرباز مسلمانوں کی تمنا کررہے تھے اور مناسب استعاروں کے ساتھ فرمایا ہے:

ای آفتاب حسن برون آ دمی ز ابر — کان چہرۂ مشعشع تا بانم آرزوست
یعقوب وار وا سفاہا ہمی زنم — دیدار خوب یوسف کنعانم آرزوست
زین ہمرہان سُست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
جانم ملول گشت ز فرعون و ظلم او — آن نور روی موسیٰ عمرانم آرزوست

در اصل مولوی اپنے زمانے کا بہترین ردعمل تھے، جہاں وہ ساری دنیا کو مبانی زندگانی سے آشنا کراتے تھے مسلمانوں کو بالخصوص جہد جہاد، تحریک و مقابلہ پر آمادہ کرتے تھے اور انہیں اعلانیہ مغلوں کے خلاف صف آرائی پر اکساتے تھے جیسا ''فیہ مافیہ'' کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مغلوں کو اپنی مجلسوں میں (جب کہ اس میں مغلوں کا کارندہ ''معین الدین پروانہ'' بھی موجود ہوا کرتا تھا) سخت و سُست کہتے رہتے تھے اور ان کی اسلام دشمنی کو سختی کے ساتھ نشانۂ تنقید بناتے تھے، مولوی جو ایک سچے مسلمان کی طرح دلبرانہ فکر و نفسیات رکھتے تھے انہیں ہرگز شکست قبول نہ تھی چنانچہ ہمیشہ فاسد و ظالمانہ ماحول سے نبرد آزما رہتے تھے اور اس راہ میں ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں پائی گئی

جیسا کہ فرماتے ہیں:

چہ دانی تو کہ در باطن چہ شاہی ہمنشین دارم　　رخ زرین من منگر کہ پای آہنین دارم

مولوی فتنہ و فساد کے خلاف ہمیشہ شمشیر بکف نظر آتے ہیں اور تمام مسلمانوں کو تشویش دلاتے ہیں تاکہ وہ بھی ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوکر لشکر تاتار سے جنگ کریں تاکہ قوی استقلال اور اسلامی وقار بحال کیا جاسکے۔

چودھویں صدی ہجری یعنی اقبال کا زمانۂ حیات، مولوی کے عہد کے مسلمانوں کی صورت حال سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا کیونکہ اس زمانے میں اکثر اسلامی ملکوں کی آبادی ''اجنبیوں کا اجتماع تھی اور مسلمان عاجزی و ناتوانی، فقیری و قناعت شعاری، مایوسی و محرومی'' در بدری اور المناکیوں کے عادی ہوگئے تھے اور اب ان میں مزید طاقت وعظمت، جلال و رعب اور جہد و جہاد کی تاب نہ تھی۔ اس رخ سے یہ لگتا ہے کہ اگرچہ مولوی اور اقبال دو مختلف ادوار کی پیداوار ہیں مگر ان دونوں زمانوں میں مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، دینی اور فکری حالات و کوائف ایک دوسرے سے بے پناہ مشابہت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اقبال نے قومی بیداری کے لئے مولوی کا راستہ اختیار کیا اور اس میدان میں وہی کردار ادا کیا جو ساتویں صدی میں مولوی نے ادا کیا تھا۔ فرماتے ہیں:

چو رومی در حرم دادم اذان من　　ازو آموختم اسرار جان من

بہ دور فتنۂ عصر کہن او　　بہ دور فتنۂ عصر روان من

اقبال نے اپنی پہلی مثنوی یعنی ''اسرار خودی'' کو (جس نے لوگوں کے ذہنوں میں انقلاب برپا کردیا تھا) مولانا کے انہیں ولولہ خیز اشعار سے شروع کیا تھا۔ وہ اس مثنوی کے تخلیق کا سبب یوں بیان فرماتے ہیں:

''طاقت وقوت کے بغیر مذہب محض ایک فلسفہ ہے، یہ ایک مسلم حقیقت ہے اور دراصل اس مثنوی کی تخلیق کا مقصد بھی یہی تھا''۔

مذکورہ اقتباس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ منفی اور غیر اسلامی تصوف کے سخت خلاف تھے، اقبال نے ''اسرار بے خودی'' میں افلاطون کو ان کی عدم شجاعت کی بناپر سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور ایسی ملت مسلمہ کو کہ جو ادبیات تصوف کے سبب منفی عقائد و موہوم و مفروضات کا شکار ہوگئی ہے آگاہ کیا ہے افلاطون یونانی کے بارے میں کہتے ہیں:

آنچنان افسون نا محسوس خورد اعتبار از دست و چشم و گوش برد

اقبال کی رو سے منفی تصوف زندگی کے ہر مرحلے میں منفی اثر مرتب کرتا ہے خصوصاً مسلمانوں کے لئے چنگیز و ہلاکو کے جہاں سوز حملوں کے برابر خطرناک ہوسکتا ہے۔

اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں مولوی کو مختلف القاب سے یاد کیا ہے، جاوید نامہ میں فرماتے ہیں:

روح رومی پردہ ہا را بر درید از پس کہ پارۂ آمد پدید
پیکرش روشن ز نور سرمدی در سراپایش سرور سرمدی
بر لب او سرّ پنہان وجود بندہای حرف وصوت از خود کشود
پیر رومی را رفیق راہ ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست پای او محکم فتد در کوی دوست
فرد از وی صاحب جذب کلیم ملت از وی وارث ملک عظیم

اقبال ''ارمغان حجاز'' میں یوں فرماتے ہیں:

بہ کام خود دگر آن کہنہ می ریز کہ باجامش نیرزد ملک پرویز
ز اشعار جلال الدین رومی بہ دیوار حریم دل بیاویز
سراپا درد و سوز آشنائی وصال او زبان دان جدایی
جمال عشق گیرد از نی او نصیبی از جلال کبریایی
ز رومی گیر اسرار فقیری کہ آن فقر است محسود امیری
حذر زان فقر و درویشی کہ از وی رسیدی بر مقام سر بزیری
ز چشم مست رومی وام کردم سرودی از مقام کبریایی

اقبال ''بانگ درا'' میں فرماتے ہیں:

گفت رومی ہر بنای کہنہ کاباداں کنند می ندانی اول آن بنیاد را ویران کنند

''جاوید نامہ'' اس دعوی کی دلیل و گواہ ہے کہ مولانا روم اقبال کے پیر ہیں جو انہیں سات آسمانوں، کہکشاؤں، چاند، مریخ، زحل، مشتری اور دوسرے ستاروں کی سیر کراتے ہیں اور دنیا کے پوشیدہ اسرار و رموز سے یکے بعد دیگرے آگاہ کراتے ہیں۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

عشق شور انگیز بی پروای شہر شعلۂ او میرداز غوغای شہر

خلوتی جوید بہ دشت و کوہسار　　یا لب دریای ناپیدا کنار
من کہ دریا را ندیدم محرمی　　بر لب دریا بیاسودم دمی
بادل خود گفتگو ہا داشتم　　آروزہا جستجوھا داشتم
آنی و از جاودانی بی نصیب　　زندہ و از زندگانی بی نصیب
نشتہ و دور از کنار چشمہ ساز　　می سرودم این غزل بی اختیار

اقبال یہاں مولانا کی مشہور غزل لے کر آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایک سچا آدمی تلاش کریں، جب وہ مل جائے تو اس کا ہاتھ تھام لیں اور دنیا کی رہنمائی کریں۔

بگشای لب کہ قند فراوانم آرزوست　　بنمای رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست

اس وقت جب اقبال یہ غزل تخلیق فرمارہے تھے، مولانا اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہیں اور اقبال کے رو برو ظاہر ہوجاتے ہیں اور پھر انہیں خواب سے بیدار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

روح رومی پردہ ہا را بر درید　　از پس کہ پارۂ آمد پدید
طلعتش رخشندہ مثل آفتاب　　شیب او فرخندہ چون عہد شباب
حرف او آئینہ ی آویختہ　　علم با سوز درون آمیختہ

مولانا کی روح اقبال سے محو گفتگو ہے، اقبال نے مولانا سے سوالات کرنا شروع کئے اور مولانا نے اس کے جواب دیئے پہلا سوال جو اقبال نے مولانا سے کیا وہ یہ تھا:

گفتمش موجود و ناموجود چیست؟　　معنی محمود و نامحمود چیست؟

مولانا ہر سوال کا تفصیلی جواب دیتے ہیں، اقبال کے سوالات تسلسل کے ساتھ جاری ہیں ایسا لگتا تھا جیسے دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہوں، اقبال نے مولانا کی گفتگو کو بارہا اپنے شعروں میں نظم کیا ہے علاوہ ازیں کبھی کبھی مثنوی معنوی کے وہ اشعار بھی استعمال میں لاتے ہیں جو ان کے شعری موضوعات سے مطابقت رکھتے تھے۔ مثلاً اقبال کے ایک سوال کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں:

گفتم این زادن نمی دانم کہ چیست　　گفت شانی از شئون زندگی است

اس میں اقبال نے مولانا کے مندرجہ ذیل شعر سے استفادہ کیا ہے:

آدمی دید است باقی پوست است　　دیدن آن باشد کہ دید دوست است
جملہ تن را در گداز اندر بصر　　در نظر رو، در نظر رو، در نظر

رومی اقبال کا ہاتھ تھام لیتے ہیں اور انہیں تمام سیاروں کی سیر کراتے ہیں، اس طرح کہ وہ مختلف ارواح سے آشنا ہو جائیں اقبال ان سے بھی موجودات کے سلسلے میں بحث کرتے ہیں۔

معنوی نقطۂ نظر سے ان دونوں شعرا کے یہاں بہت سے چیزیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ رومی اور اقبال دونوں ہمیشہ روح دین اور بنیادی مسائل پر توجہ دیتے ہیں اور اپنے بیانات سے لوگوں کو مایوسی، ناامیدی، بے عملی، لالچ اور ڈر جیسے منشیات سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کی طرح رومی کا پیغام بھی انانیت کا حامل ہے، دونوں کی فکریں قرآن سے از حد متاثر ہیں اور زمان و مکان کے محیط سے بے نیاز ہیں، عشق اکثر شعرا کا مرکزی موضوع رہا ہے۔ البتہ رومی اور اقبال نے جس طرح اس لفظ سے استفادہ کیا ہے وہ بے مثال و بے نظیر ہے۔

یہ دونوں شعراء فقر و تصوف کے حامی ہیں۔ البتہ ان کا فقر، ناداری، آرام طلبی بے کاری، سستی، اسیری اور بے توجہی والا نہیں ہے بلکہ ان کا فقر غیرت، فعالیت، ترقی معنوی و مادی سے تعبیر ہے اور تعلیمات قرآنی سے ان کا ٹکراؤ نہیں ہے۔

رومی کا خیال ہے کہ آدمی نصیب و تقدیر کی رو سے آزاد ہے البتہ بعض ایسے مسائل میں جہاں اس کی مصلحتیں مقتضی ہوتی ہیں وہاں وہ مجبور و پابند بھی ہے۔ اقبال کا بھی یہی نظریہ ہے بلکہ وہ تو کثرت و تقسیم تقدیر کے بھی قائل ہیں۔

مولوی کے چند اشعار جو عشق و فقر اور تقدیر کے سلسلے میں ہیں اس طرح ہیں:

ہر کرا جامہ ز عشقی چاک شد — او ز حرص و جملہ عیبی پاک شد
شاد باش ای عشق خوش سودای ما — ای طبیب جملہ علت ہای ما
ای دوای نخوت و ناموس ما — ای تو افلاطون و جالینوس ما
علت عاشق ز علتہا جداست — عشق اصطرلاب اسرار خداست
ہر چہ گویم عشق را شرح و بیان — چون بہ عشق آیم خجل باشم از آن
رومی، آن عشق و محبت را دلیل — تشنہ کامان را کلامش سلسبیل
پیر روم آن صاحب ذکر جمیل — ضرب او را سطوت ضرب خلیل
پیر روم آن مرشد اہل نظر — گفت مریخ است این عالم نگر
پیر رومی آن امام راستان — آشنای ہر مقام راستان

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فکر اقبال پر رومی کی کتنی گہری چھاپ ہے۔

حوالے

۱- بدیع خراسانی، بدیع الزمان محمد حسن فروزانفر: رسالہ در تحقیق و تدریس مولانا جلال الدین محمد، مشہور بہ مولوی، ص ۸۰

۲- ایضاً، ص ۱۴۹

۳- سروش، مجلّہ دو ماہی، ج ۴، شمارہ ۳، ص ۳، اسلام آباد، فروری ۱۹۷۸ء

۴- ''در شناخت اقبال'' مجموعۂ مقالات کنگرۂ جہانی بزرگداشت علامہ اقبال لاہوری، ص ۱۳۷-۱۴۰، تہران، اسفند ۱۳۷۴

۵- سروش، مجلّہ دو ماہی، ج ۴، شمارہ ۳، ص ۳، اسلام آباد، فروری ۱۹۷۸ء

۶- ''در شناخت اقبال'' مجموعۂ مقالات کنگرۂ جہانی بزرگداشت علامہ اقبال لاہوری، ص ۱۳۷-۱۴۰، تہران، اسفند ۱۳۷۴

۷- ''ہنر و مردم'' ویژہ نامۂ ایران و پاکستان، از انتشارات وزارت فرہنگ و ہنر حوزہ روابط فرہنگی، آبان ماہ ۲۵۳۷، شاہنشاہی، شمارہ دوم، ص ۱۰۰-۱۰۱

۸- ایضاً، ص ۴۸

۹- ایضاً، ص ۱۰۲-۱۰۳